حیا آتی ہے

باپ نے ایک بیٹی کی آرزو کی
ماں نے پیدا کیا
ربِ کریم نے اس میں جان ڈالی ۔
مگر جس کی آرزو کی گئی جسے پیدا کیا گیا
جس میں جان ڈالی گئی ، وہ ننگی تھی ۔
تنے بھائی نے اسے دیکھا تو حیا آ گئی ۔
تب ایک بھائی نے
اس بے لباس تخلیق کو لباس پہنانے کے لیے
اپنی تخلیق کا تمام جوھر فروخت کر دیا ۔
(یہ کہانی حیا کی معراج پر تمام انسانیت
کا سر جھکا دیتی ھے ۔

حیا آتی ہے

گنگا کا پانی اتر چکا تھا۔ پھر بھی جس قدر پانی بہہ رہا تھا وہ کسی کی بوڑھی لاش کو بہا کر اِدھر سے اُدھر لے جا سکتا تھا یا ساحل تک پہنچا سکتا تھا۔ کسی بھی دن، کسی بھی وقت میری لاش یہاں سے بہتی ہوئی گزر سکتی تھی لیکن ابھی میں موت سے ڈر رہا ہوں۔

جب موت سے ڈر لگتا ہے تو انسان جینے کا کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتا ہے۔ میں اس بہانے کبھی کبھی بادام تلی گھاٹ پر آ کر کھڑا ہو جاتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ کبھی کسی وقت میری آسی کی لاش کہیں سے بہتی ہوئی ساحل پر میرے قدموں تک آئے گی تو میں اس سے لپٹ کر ماتم کروں گا پھر اس کی لاش کے ساتھ بوڑھی گنگا کی آغوش میں بہہ جاؤں گا۔

یوں میں اب تک زندہ ہوں۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ ماہ دسمبر تک بہتی ہوئی لاشیں اکثر نظر آتی تھیں۔ جنیوا کی امدادی پارٹی اور ریڈ کراس سوسائٹی نے جگہ جگہ کیمپ بنا دیئے تھے تاکہ بچھڑے ہوئے رشتوں اور بچھڑی ہوئی محبتوں کو زندہ یا مردہ ان کیمپوں تک پہنچایا جائے۔ مجھ جیسے تلاش کرنے والے ان کیمپوں میں جاتے تھے اور لہو کے رشتوں کو پہچاننے کی کوششیں کرتے تھے۔ لیکن وہاں بھی میری آسی مجھے نہ ملی۔

آسی میری چھوٹی بہن ہے۔ بہت کم لوگ بہن کے ساتھ جینا یا مرنا پسند کرتے ہیں۔ محبوبہ کے ساتھ موت آئے تو ایک یادگار رومانی داستان بطور مثال قائم رہ جاتی ہے۔ یہ

میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ میں سچ مچ اپنی بہن کی ساتھ مر سکتا ہوں یا نہیں لیکن جب بھی کوئی لہو کا رشتہ بچھڑتا ہے یا مرتا ہے تو ہم چھاتی پیٹ کر اس کے ساتھ مرنے کے دعوے کرتے ہیں اور اس کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔

میرا نام فضل احمد ہے میں اپنی ماں' ایک بیوی اور ایک بچی کے ساتھ دکھن منڈی میں رہتا تھا۔ ان دنوں میرا کوئی ایک ٹھکانہ نہیں تھا۔ بدلتے ہوئے حالات کے مطابق مجھے بنگالی بن کر رہنا پڑتا تو میں بنگالی بیوی کلثوم کے ساتھ دکھن منڈی آجاتا اور جب بہاری بن کر پناہ لینے کی ضرورت پیش آتی تو محمد پور میں اپنے بھائی کے ہاں چلا جاتا تھا۔

محمد پور میں میرا نام صحیح تلفظ کے ساتھ فضل احمد تھا۔ دکھن منڈی میں یہی نام فجل احمد بن جاتا تھا۔ ایک جگہ میں بہاری اور میری زبان اردو تھی۔ دوسری جگہ میں اپنی بنگالی بیوی کے طفیل پیدائشی بنگالی تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری طرح بہت سے لوگ اپنی جان کی سلامتی کے لیے دوغلی زندگی گزارتے ہیں۔

مارچ کا مہینہ شروع ہوا تو شہر کی فضا پر عجیب سی گھمبیرتا چھا گئی۔ یوں تو سب ہی چپکے چپکے ایک عرصے سے سمجھتے آرہے تھے کہ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ بازار سے کپڑے' اناج اور دوسری ضروریات زندگی کی چیزیں آہستہ آہستہ غائب ہو رہی تھیں۔ جن کے پاس کچھ پیسے تھے' وہ راشن جمع کر رہے تھے جن کے پاس زیادہ پیسے تھے' وہ لاہور اور کراچی کی طرف بھاگ رہے تھے۔

پھر اچانک ہنگامے شروع ہو گئے۔ ان دنوں چونکہ بہاریوں کا پلہ بھاری تھا۔ اس لیے میں بھائی سے ملنے اپنے خاندان کے ساتھ محمد پور چلا گیا۔ اس وقت آسی بھی میرے ساتھ تھی اور دسویں جماعت میں اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ دراصل میں اسی کے لیے زیادہ فکر مند تھا۔ وہ بچپن سے عربی اور اردو پڑھتی آئی تھی اردو بولنے والی لڑکیوں کے ساتھ وقت گزارتی تھی۔ اس لیے بنگالی نہیں بول سکتی تھی۔ محمد پور میں ہی اس کا گزارا ہو سکتا تھا۔

ایوب گیٹ کے قریب میرے بھائی کے مکان میں صرف دو کمرے تھے۔ وہاں وہ بھابی اور جوان بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔ ادھر سے میرا جو قافلہ آیا تو اس میں امی اور آسی کے علاوہ میری بیوی کلثوم اور میری ننھی بیٹی ڈولی بھی تھیں۔ میرے بھائی اور بھابی

نے ہمیں دیکھ کر ناگواری کا اظہار کیا لیکن حالات ایسے تھے کہ انہیں ہمارے لیے ایک کمرہ خالی کرنا پڑا۔

بھابی کی بے زاری بجا تھی کیونکہ میں کبھی مستقل طور سے کماتا نہیں تھا۔ کلثوم طعنے دیتی تو کبھی سائیکل رکشا چلا لیتا یا پھر سینما کے ٹکٹ بلیک کرتا تھا۔ اب تو سینما گھر بھی بند پڑے تھے۔ ہمارے کھانے پینے کا خرچ بھی بھائی پر آپڑا تھا۔ بہاری عورتیں پیٹی کوٹ اور بلاؤز کے بغیر ساریاں نہیں پہنتیں۔ کلثوم سے شادی کرنے کا ایک فائدہ یہ تھا کہ وہ عام بنگالی عورتوں کی طرح صرف ایک ساڑی میں گزارا کر لیتی تھی۔ پیٹی کوٹ اور بلاؤز سلوانے کے لیے پیسے ہوتے ہی نہیں تھے۔

ایک نقصان بھی تھا کہ وہ مچھلی زیادہ کھاتی تھی اور مچھلیاں ہضم کرنے کے لیے میرے ہی بستر پر سوتی تھی۔ میں نے بھائی کے ہاں پہنچ کر اسے سمجھایا۔ "دیکھو! یہاں ایک ہی کمرہ ہے۔ امی اور آسی کیا سوچیں گی؟ تم آسی کے پاس جا کر سو جاؤ۔"

وہ برا مان کر آسی کے پاس چلی گئی۔ ڈولی میری امی کے پاس سو رہی تھی۔ میں لائٹ آف کر کے اپنے بستر پر آگیا۔ آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ رات کی تاریکی میں تقریباً سارا شہر جاگ رہا تھا۔ کسی کو اپنے جان و مال کی فکر تھی۔ کوئی لوٹ کھسوٹ میں مصروف تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ برے وقت کے لیے کیڑے مکوڑے بھی خوراک جمع کر لیتے ہیں، میں نے کچھ نہیں کیا۔ بھائی کب تک میرا بوجھ اٹھائے گا؟ اب مجھے کچھ کرنا چاہیے۔

میں نے کوئی ہنر نہیں سیکھا۔ کبھی کوئی ملازمت نہیں کی۔ صبح سے شام تک مزدوری کرنے کے تصور ہی سے دل گھبرانے لگتا تھا۔ ایسے وقت مجھ جیسے لوگ وقت سے فائدہ اٹھا کر لوٹ کھسوٹ کے متعلق ہی سوچتے ہیں۔ میں اسی لائن پر سوچ رہا تھا کہ اچانک میرا خالی بستر بھر گیا۔

وہ اپنی سانسوں میں مچھلی کی بساند لے کر آگئی تھی۔ میں اس بساند کا عادی ہوں۔ اس لیے کہ میں بھی شوق سے مچھلیاں کھاتا ہوں۔ اس وقت میں نے غصے میں سرگوشی کی "تم کیوں آگئیں؟"

وہ بھی سرگوشی میں بولی۔ "آسی گھم کورے نیلو (آسی سو چکی ہے)"

میں نے کہا۔ "جوان لڑکیوں کی آنکھیں سوتی ہیں مگر احساسات جاگتے رہتے ہیں۔

کبھی ہماری ڈولی بھی جوان ہوگی۔ تمہیں ابھی سے محتاط رہنا چاہیے۔"

وہ جواباً محتاط رہنے کے لیے میری سانسوں میں سما گئی۔ سانولی سلونی کلثوم پٹ سن کے سنہرے ریشوں کی طرح ملائم بھی ہے اور مضبوط بھی۔ اکثر اپنے ارادوں کی مضبوطی سے مجھے باندھ لیتی ہے۔ آدھی رات کے قریب مکان کے دروازے پر دستک سنائی دی۔ میں بستر سے اٹھ کر دروازہ کھولتا ہوا باہر آیا۔ میرے بھائی جان دوسرے کمرے کا دروازہ کھول کر برآمدے میں آچکے تھے اور محلے کے کچھ لوگوں سے باتیں کر رہے تھے۔

محلے کا ایک نوجوان کہہ رہا تھا۔ "آپ لوگ یہاں آرام سے سو رہے ہیں اور محلے کے ہر گھر کا ایک آدمی پہرہ دے رہا ہے۔ آپ دونوں میں سے کسی ایک کو ہمارے ساتھ جاگنا چاہیے۔"

میرے بھائی جان نے میری جانب دیکھا۔ میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ میں ان کے ساتھ جا رہا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں قمیص پہننے کے لیے کمرے میں آیا۔ کلثوم نے راز داری سے کہا۔ "میرے پاس یہی ایک ساری رہ گئی ہے' کہیں سے ہاتھ لگے تو میرے لیے ضرور لے آنا۔"

یہ بات میرے دماغ میں بھی پک رہی تھی۔ لوٹ کھسوٹ کی فضا گرم تھی۔ کسی بھی گھر میں گھس کر ساری اور چاول وغیرہ اٹھا کر لائے جا سکتے تھے۔ کمائی کرنے کا بہترین موقع تھا۔ میں کلثوم سے وعدہ کر کے باہر آگیا لیکن اس رات کچھ نہ ہو سکا۔ جن لوگوں کے ساتھ میں پہرہ دینے نکلا تھا۔ وہ سیدھے سادے اور بے ضرر لوگ تھے۔ صرف اپنے جان و مال اور بہو بیٹیوں کے لیے باری باری جاگنا چاہتے تھے۔

اتنا تو میں سمجھتا ہوں کہ جہاں گھوڑے ہوتے ہیں' وہاں گدھے بھی پائے جاتے ہیں۔ شریفوں کے ساتھ موقع پرست غنڈے بھی ہوتے ہیں۔ چند راتیں جاگنے کے بعد مجھے اپنے مطلب کے بندے مل گئے۔ انہوں نے مجھے نور جہاں روڈ کی طرف پہرہ دینے کے لیے بلایا۔ وہاں دس آدمی ہمارے مطلب کے تھے۔ ہم دسوں بیک وقت پہرے داری کے فرائض چھوڑ کر ڈکیتی کے لیے نہیں جا سکتے تھے۔ لہٰذا فیصلہ یہ ہوا کہ ہر رات صرف چار آدمی محلے سے باہر جائیں گے۔ باقی چھ پہرہ دیں گے۔ اس رات میری باری نہیں

آئی۔

صبح سے پہلے چاروں خالی ہاتھ واپس آئے۔ ایک کی قمیص پر لہو کے چھینٹے تھے۔ وہ اپنی قمیص اتارتے ہوئے بولا۔ "سالا چیخنا چاہتا تھا۔ میں نے چھری پھیر دی۔"

دوسرے نے کہا۔ "بنگالیوں کے پاس ہے ہی کیا؟ پہننے کے لئے کپڑے نہیں ہوتے۔ کھانے کے لیے اناج نہیں ہوتا۔ ہمیں کیا خاک ملے گا ان کے گھروں سے؟"

تیسرے نے کہا۔ "ادھر فارم گیٹ اور نیو مارکیٹ کی طرف مالدار بنگالی رہتے ہیں۔ ان کی عورتیں سونے کے زیورات پہنتی ہیں۔ کل ہم ادھر جائیں گے۔"

میں نے کہا۔ نہیں، کل ہماری باری ہے ہم جائیں گے۔"

وہ چاروں میرے خلاف ہوگئے کیونکہ وہ خالی ہاتھ آئے تھے۔ شرمندگی مٹانے کے لیے آنے والی رات اپنی کارکردگی دکھانا چاہتے تھے۔ لہٰذا فیصلہ یہی ہوا کہ کوئی بھی جائے۔ مال غنیمت میں سب کا حصہ ہوگا۔ اس لیے وہ چاروں جائیں گے۔ یعنی اگلی رات بھی میری باری نہیں آئی۔

دوسری رات وہ چاروں گئے اور صبح سے پہلے ڈھیر ساری چیزیں بٹور کر لائے۔ کپڑے، ریڈیو، ٹیلی وژن اور دو ہزار روپے نقد۔ ان کے بیان کے مطابق انہوں نے کسی رئیس کے گھر میں ڈاکہ ڈالا تھا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ وہ چاروں بے ایمانی کر رہے ہیں۔ میں ان کی یہ بات تسلیم نہیں کر سکتا تھا کہ رئیس کی کوٹھی میں انہیں سونے کے زیورات نہ ملے ہوں اور صرف دو ہزار روپے نقد حاصل ہوئے ہوں۔ میں نے سوچ لیا کہ میری باری آئے گی تو میں بھی گھپلا کروں گا۔

بہرحال مال غنیمت کے بٹوارے میں مجھے دو سو روپے، ایک پاجامہ، ایک جوڑی چپل اور ایک ریڈیو ملا۔ میں نے سوچا کہ بھائی جان کو پاجامہ اور چپل دے کر خوش کر دوں گا کیونکہ ہم ان کے گھر میں بیٹھ کر کھا رہے تھے۔ لیکن دو سو روپے چھپا لوں گا۔ اس طرح بھابی خوش ہو جائے گی۔

جب میں نے بھائی جان کو اپنی طرف سے وہ تحفے دیے تو وہ ایک دم سے بگڑ گئے۔ انہوں نے میرا گریبان پکڑ کر کہا۔ "چور بدمعاش! کیا یہ شریفوں کا کام ہے۔ اگر کوئی ہمارے گھر کو لوٹنے آئے تو ہم پر کیا گزرے گی؟"

میری امی مجھے بہت چاہتی ہیں۔ انہوں نے فوراً ہی میرا گریبان ان کی گرفت سے چھڑاتے ہوئے کہا۔ "کیا میرے بچے کو مار ڈالو گے؟ اگر یہ تمہارے گھر بیٹھ کر کھا رہا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ......"

بھائی جان نے ڈانٹ کر کہا۔ "بس کیجئے امی! آپ کے لاڈ پیار نے اسے چور بنا دیا ہے لیکن میں عزت دار آدمی ہوں۔ میرے گھر میں یہ تماشا نہیں ہو گا۔ اگر میرے گھر میں شرافت سے رہنا ہے تو چوری کا تمام مال میرے سامنے رکھ دو۔ میں محلے کے بڑے بوڑھوں کو بتاؤں گا کہ رات کو پہرے داری کی آڑ میں کچھ لوگ جرائم کے مرتکب ہو رہے ہیں۔"

"ہائے ہائے۔ کیا تم محلے والوں کے سامنے میرے بیٹے کو چور بناؤ گے۔ کیا اس وقت تمہاری عزت پر حرف نہیں آئے گا؟ صاف کیوں نہیں کہتے کہ ہم یہاں سے چلے جائیں۔"

بھابی نے بھائی جان سے کہا۔ "ہم تو نیکی کر کے پھنس گئے۔ محلے والے آپ کے بھائی پر تھوکیں گے تو وہ تھوک ہم پر بھی آئے گا۔ آپ ان سے کہیں کہ چوری کا مال لے کر یہاں سے چلے جائیں اور پھر کبھی ادھر کا رخ نہ کریں۔"

امی نے کہا۔ "ہاں بہو! اپنا کلیجہ ٹھنڈا کر لو۔ ہم ابھی یہاں سے چلے جائیں گے۔"

امی میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی دوسرے کمرے میں لے گئیں۔ کلثوم نے روانگی کے لیے سامان باندھتے ہوئے کہا۔ "امی کچھ پائی نا۔ پاجامہ اور چاول نئے کی کوربو (مجھے تو کچھ نہ ملا۔ پاجامہ اور چپل لے کر کیا کروں گی)"

میں نے اس کے قریب جھکتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ "اری نیک بخت میری جیب میں دو سو روپے ہیں۔ تیرے لیے نئی ساری خرید دوں گا۔"

وہ خوش ہو گئی۔ بیوی کو خوش کر کے اپنا دل بھی باغ باغ ہو جاتا ہے۔ میں نے امی کو دو سو روپے کی ہوا بھی نہیں لگنے دی۔ اگرچہ میں آسی کو بہت چاہتا ہوں۔ اس کے لیے بھی ایک ساری خرید سکتا تھا۔ ننانوے فیصد گھرانوں میں بیوی کا سکہ چلتا ہے۔ کلثوم نے دو سو روپے اپنے آنچل میں باندھ لیے تھے۔ بھائی جان نے آسی کو اپنے پاس رکھ لیا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان ہنگاموں میں وہ ایک چور بھائی کے پاس رہے۔

جب ہم وہاں سے جانے لگے تو بھائی جان نے کلثوم کو سمجھایا۔ "دلہن! تم ایک بنگالی عورت ہو' اپنے میاں کو سمجھاؤ۔ ہم بنگالیوں سے نفرت نہیں کرتے۔ اگر کرتے تو تم ہمارے گھر کی بہو نہ بنتیں۔ کیا اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ تم اپنے میاں کے ساتھ اپنوں کا گھر لوٹ رہی ہو؟"

"آپنار بھاشا آمی بوجھتے پاری نا (آپ کی زبان میری سمجھ میں نہیں آتی)"

یہ کہہ کر وہ میرے ساتھ باہر آ گئی۔ کچھ دور جا کر ہمیں ایک سائیکل رکشا مل گیا۔ سائیکل رکشا کی سیٹ پر صرف دو آدمیوں کی گنجائش ہوتی ہے۔ کلثوم نے ڈولی کو گود میں بٹھا لیا۔ امی میرے پاؤں کے پاس نیچے بیٹھ گئیں۔ یہ مائیں ہر حال میں سمجھوتہ کر لیتی ہیں۔ اپنے قدموں تلے جنت رکھ کر ہمارے قدموں تلے بیٹھ جاتی ہیں۔

ہم رکشا میں نیو مارکیٹ تک آئے۔ وہاں سے پیسے بچانے کے لیے بس میں بیٹھ کر رتھ کھولا جا رہے تھے کہ گلستان کے پاس بس خراب ہو گئی۔ وہاں سے پیدل نواب پور آئے تو حقا کے شراب خانے کے پاس غنڈوں نے ہمیں گھیر لیا لیکن یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ ہم بنگالی ہیں یا بہاری؟ ایسی صورت میں انہوں نے کلثوم کے آنچل سے دو سو روپے نکالے' ریڈیو ضبط کیا پھر ہمیں چھوڑ دیا۔

گناہ بے لذت والی بات ہو گئی۔ بھائی کے گھر سے بھی نکلے اور چوری کا مال بھی ساتھ نہ رہا۔ کلثوم رونے لگی۔ میں نے دلاسا دیا۔ گھر پہنچ کر اس کے آنسو پونچھے اور وعدہ کیا کہ اس کی ساری کے لیے لمبا ہاتھ ماروں گا۔

دکھن منڈی اور اس کے اطراف بنگالیوں کی آبادی تھی۔ وہاں واردات نہیں کر سکتا تھا پہچان لیے جانے کا خدشہ تھا۔ دو مہینے اس انتظار میں گزر گئے کہ کہیں لمبا ہاتھ مارنے کا موقع ملے گا۔ امی اور کلثوم دونوں کی ساریاں میلی چیکٹ ہو رہی تھیں۔ کبھی سالن خریدنے اور کبھی چاول خریدنے کے پیسے نہیں ہوتے تھے۔ ہم چٹائی پر سوتے تھے اور پرانے کپڑوں کی کترن سے بنا گا کھیتا اوڑھتے تھے۔ وہاں غربت کا یہ عالم تھا کہ جس کے پاس چھپانے کے لیے ایک چادر ہوتی تھی' وہ مالدار سمجھا جاتا تھا۔

میرے گھر کی یہ حالت تھی کہ کلثوم دو ماہ میں ایک بار ساری دھو کر پہن لیتی تھی۔ وہ اس طرح کہ رات کو بتی بجھانے کے بعد ساری کو دھو کر سوکھنے کے لیے کمرے کی کھڑکی

کے پاس پھیلا دیتی تھی
اسی برآمدے میں سوتی تھیں مجھے کبھی پوچھنے کا حوصلہ نہ ہوا کہ وہ کس طرح ساری دھوتی سکھاتی اور پہنتی ہیں۔ پوچھنا تو دور کی بات ہے سوچنے سے ہی حیا آتی تھی۔ وہ جو تخلیق کا سرچشمہ ہے جو بھائی جان کو مجھ کو اور آسی کو جنم دے کر اپنی جوانی کو بیوگی کی دھوپ میں سکھاتی اور جلاتی رہی' اب بڑھاپے میں صرف اولاد کے نام کو اوڑھ رہی تھی۔ کوئی پوچھنے والا نہ تھا کہ کیا دھوتی ہو اور کیا پہنتی ہو؟ کیونکہ اولاد شادی کے بعد صرف بیوی بچوں میں اپنا سب کچھ تقسیم کرتی رہ جاتی ہے۔
مجھے حیا آئی تو ایک رات میں گھر سے نکل گیا۔ مصمم ارادہ تھا کہ کہیں سے ماں کے لیے ایک ساری لاؤں گا۔ مجھے مزدوری نہیں آتی۔ بھیک مانگنا بھی نہیں آتا۔ صرف چھیننا جھپٹنا جانتا ہوں۔ ایسے وقت یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ میں کسی دوسری ماں کے بدن سے ساری نوچ کر اپنی ماں کو پہناؤں گا۔ میں کیا کروں مجھے حیا آرہی تھی۔ اکثر حالات میں ہم انسانوں کو صرف اپنے معاملے میں حیا آتی ہے۔
راستے میں ایک سپاہی نے مجھے روکا۔ میں نے گڑگڑا کر کہا۔ "میری ماں سخت بیمار ہے مجھے جانے دو۔ میں ایک شریف آدمی ہوں۔"
سپاہی کی بھی ایک ماں ضرور ہوگی۔ اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ میں فقیرا پل کے پاس پہنچ کر گلیوں میں بھٹکنے لگا۔ شہر میں ایک عرصے سے خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا اس لیے بہت سے گھروں میں روشنی نظر آئی۔ سہمے ہوئے لوگ گہری نیند نہیں سوتے تھے۔ تھوڑی دیر میں یہ بات سمجھ میں آگئی کہ کسی پکے مکان میں دال نہیں گلے گی۔ جن کے پاس مال ہے وہ ہوشیاری سے راتیں گزارتے ہیں اور انہوں نے یقیناً حفاظتی اقدامات بھی کیے ہوں گے۔
میں بانس کی ایک جھونپڑی کے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔ اندر سے ایک عورت کی آواز سنائی دی۔ وہ اپنے بچے سے کہہ رہی تھی۔ "چپ کورے گھم کورے لو ایک ماوڑا آشتے چھے (چپ چاپ سو جاؤ۔ ایک بہاری آرہا ہے۔)"
یہاں اردو بولنے والے سب ہی بہاری نہیں ہیں پنجاب' یوپی اور مدراس کے لوگ بھی اردو بولتے ہیں لیکن سب ہی بہاری کہلاتے ہیں اور نفرت سے انھیں ماوڑا کہا جاتا

ہے۔ پہلے تو مجھے یوں لگا جیسے اس عورت کو میری آمد کا علم ہوگیا ہے کہ ایک بہاری آرہا ہے لیکن کیسے؟ میں بہاری نہیں ہوں' میں بنگالی نہیں ہوں' میں مدراسی اور پنجابی بھی نہیں ہوں۔ اگر میں انسان ہوں تو پھر شوکت صدیقی کا "تیسرا آدمی" ہوں جو آدمیوں کے درمیان آدمیت کو ذبح کرتا ہے۔

میں کچھ دیر تک بانس کی دیوار سے لگا کھڑا رہا۔ اس عورت کی بکواس سے پتہ چل گیا کہ اس کا شوہر نائٹ ڈیوٹی کے لیے گیا ہے۔ میں نے دروازے کے پاس پہنچ کر ہولے سے دستک دی۔ اندر سے آواز آئی۔ "کے؟ (کون)"

میں نے کہا "تمہارے شوہر کو حادثہ پیش آیا ہے' وہ ہسپتال میں ہے۔"

دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔ میرے ایک ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ چیختی' میں نے دوسرا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔ "خبردار آواز کروگی تو تمہیں اور تمہارے بچے کو مار ڈالوں گا۔"

میں نے دروازہ بند کر دیا۔ اس کی خوب صورت سی کٹورا جیسی آنکھیں دہشت سے پھیل گئی تھیں۔ اس کے بدن پر بھی ایک ہی ساری تھی۔ اس گھر کو دیکھ کر مایوسی ہوئی کیونکہ وہ بنگال کے کروڑوں گھروں کی طرح ایک خالی گھر تھا۔ بچہ چٹائی پر سو رہا تھا۔

میں اسے چھوڑ کر بچے کے پاس دوزانو ہوگیا اور عورت سے کہا۔ "اگر اس کی زندگی چاہتی ہو تو کپڑا چاول اور نقد رقم لے آؤ۔"

وہ فرش پر گھٹنے ٹیک کر اور ہاتھ جوڑ کر بولی۔ "تم خود ہی دیکھ لو۔ یہاں کچھ نہیں ہے۔ کھوکا کے باپ کو ابھی تنخواہ نہیں ملی' میں نے اسے بھوکا سلایا ہے۔"

میں جھلا گیا۔ اتنے عرصے بعد چوری کا موقع ملا تو بھی کچھ ہاتھ نہیں آرہا تھا۔ میں نے کہا۔ "میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھے کم از کم ایک ساری چاہیے۔ ورنہ میں......"

میں نے بات ادھوری چھوڑ کر چاقو کی نوک خوابیدہ بچے کے سینے پر رکھ دی۔ وہ ماں ہی سے سرہلا کر نہیں نہیں کی گردان کرتے ہوئے بولی۔ "میں دوں گی۔ میں تمہیں ساری لاکر دوں گی۔ چاقو ہٹالو نہیں تو میرا دم نکل جائے گا۔"

وہ اٹھ کر دوسرے کمرے کا دروازہ کھولنے لگی۔ میں نے دھمکی دی کہ کسی کو اگر بلائے گی یا شور مچائے گی تو بچہ زندہ نہیں ملے گا۔ ویسے ماؤں کی ممتا کو کون نہیں سمجھتا۔ وہ

حلق سے ذرا سی بھی آواز نکال کر اپنے بچے کی زندگی کو داؤ پر نہیں لگا سکتی تھی۔

میں نے دیکھا وہ دروازے کے پیچھے کھڑی ہوئی تھی۔ بانس کی تیلیوں سے بنے ہوئے دروازے کے پیچھے کوئی موجود ہو تو اس کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ ایک آدھ سوراخ سے وہ جھلک رہی تھی۔ شاید اپنی ممتا کا حساب کر رہی تھی۔

ممتا کے پلڑے میں اپنی شرم کو تولنے والی عورت نے سمجھ لیا کہ حیا کا کوئی وزن نہیں ہے۔ ذرا دیر بعد دروازے کے پیچھے سے اس عورت کا ہاتھ باہر آیا۔ اس ہاتھ میں ایک لپٹی ہوئی ساری تھی۔

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ ساری انسانی تہذیب کے بدن سے اتر کر آئی تھی۔ میں اندر سے لرزنے لگا۔

اس نے ساری کو میری طرف فرش پر پھینک دیا۔ وہ ساری ایسے آئی جیسے تھوک آتا ہے جیسے میری ماں نے مجھ پر تھوک دیا ہو۔ لے جاؤ۔ یہ ساری اٹھا کر لے جاؤ۔ میں تم سب کو پیدا کرتی رہوں گی۔ تم سب مجھے بے عزت کرتے رہوگے۔ میں عورت ہوں، مجبور ہوں۔

میں نے بے اختیار دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا لیا۔ اگر ہم اپنی ماؤں اور بہنوں کو لباس میں چھپا سکیں تو اپنا منہ چھپانے کی ضرورت نہ پڑے۔ تب مجھے خیال آیا کہ میں ساری اٹھا کر اس کے پاس نہیں جا سکتا اور وہ دروازے کے پیچھے سے نہیں آسکتی۔ میں جلدی سے اٹھا اور بیرونی دروازہ کھول کر باہر تاریکی میں بھاگتا چلا گیا۔

اس دن سے میرا مزاج بدل گیا۔ کوئی عورت سامنے سے گزرتی تو میری آنکھیں جھک جاتیں۔ زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر حیا کا طمانچہ پڑتا ہے تو شرم آہی جاتی ہے۔

چونکہ میں انسان ہوں اس لیے شریف بھی ہوں اور بدمعاش بھی۔ میں نے عورتوں کی عزت کرنا سیکھ لیا لیکن چوری اور ہیرا پھیری باقی رہی کیونکہ پیٹ پالنے کے یہی ڈھنگ آتے تھے۔

دسمبر کا مہینہ گولہ بارود کے دھماکوں سے گزرنے لگا۔ پھر ہم بنگلہ دیشی بن گئے۔ پہلے ہم ہندوستانی تھے پھر پاکستانی ہوئے اور اب تیسرے ملک کے باشندے بن گئے۔ مجھے تاریخ یاد نہیں اتنا یاد ہے کہ اس رات ہم مکان کا دروازہ اندر سے بند کیے سہمے سہمے بیٹھے

تھے۔ پاس پڑوس والے بتا رہے تھے کہ مکتی باہنی والے بہاریوں کے گھروں پر چھاپے مار
رہے ہیں۔ مردوں کو گولی سے اڑا رہے ہیں۔ بچوں کو خنجر کی نوک پر اچھال رہے ہیں
اور...... اور ساریاں اتار رہے ہیں۔

مجھے ڈرنا نہیں چاہیے تھا کیونکہ میری کلثوم بنگالی تھی۔ میں بھی بھاشا روانی سے بول
سکتا تھا۔ امی کو ہم گونگی بنا دیتے لیکن ہم سب طاق پر رکھے ہوئے کلام پاک کو سہمی ہوئی
نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اگرچہ مکتی باہنی کی فوج میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی اور
وہ بحیثیت مسلمان کلام پاک کا احترام کرتے تھے۔ اس کے باوجود ہمیں خطرہ تھا۔ کیونکہ جو
مقدس کتاب ہمارے گھر میں تھی' اس کی آیتوں کا ترجمہ اردو میں تھا۔ اس طرح ہم
پہچان لیے جاتے کہ ہم اردو پڑھنے اور بولنے والے بہاری ہیں۔

میں نے کہا۔ "کلثوم! تم یہ قرآن مجید کسی پڑوسی کے ہاں پہنچا دو۔"

امی نے کہا۔ "لڑکے تیرا دماغ چل گیا ہے۔ اتنی زندگی پوری بیکاری میں گزار دی۔
اب کلام پاک کے سائے میں جان جائے گی تو ہمارے کچھ نہ کچھ گناہ دھل جائیں گے۔
میں اسے اپنے سینے سے لگا کر رکھوں گی۔"

انہوں نے طاق پر سے کلام پاک کو اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس پر اتنی گرد جمی
ہوئی تھی کہ امی کو کھانسی آ گئی۔ مجھے یاد نہیں کہ کتنے برس پہلے ہم نے یہ مقدس کتاب
طاق پر رکھی تھی۔ اسے سینے سے لگانا یا پڑھنا تو دور کی بات ہے۔ ہم نے کبھی ادھر منہ کر
کے اسے چوما بھی ہوتا تو پتہ چل جاتا کہ ہمارے ایمان پر صدیوں کی گرد جمی ہوئی ہے۔

میں نے کہا۔ "امی! ہم کچھ دنوں کے لیے اس کتاب کو کسی کے ہاں رکھوا دیں گے تو
ہم نہیں بن جائیں گے۔ ایمان تو دل میں ہوتا ہے۔ کیا آپ کو اپنی ڈولی سے پیار نہیں
ہے۔ وہ ظالم لوگ اس ننھی سی بچی کو بہاری کی اولاد سمجھ کر مار......"

امی نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ گھبرا کر بولیں۔ "نہیں' نہیں' میری بچی کو کوئی
ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ میں کلام پاک کو مسجد میں رکھ آؤں گی"

انہوں نے مقدس کتاب کو زور سے بھینچ لیا۔ اس پر پیشانی ٹیک کر رونے لگیں۔ وہ
کتاب چودھویں صدی کے آخری چند سالوں سے گزر رہی تھی۔ چودہ سو سال کی تاریخ
میں ایسے موڑ بھی آئے ہیں جب مسلمانوں نے اپنی مقدس کتاب کو کافروں کے سائے

سے بچانے کے لیے ایک ملک سے دوسرے ملک ہجرت کی ہے لیکن اسلام کی تاریخ میں پہلی بار ایسا موڑ آیا تھا کہ چند مسلمان دوسرے چند مسلمانوں سے اپنی جان بچانے کے لیے کلام پاک کو اپنے گھر سے مسجد تک پہنچانے پر مجبور ہو گئے تھے اور یہ صرف اس لیے کہ اس کے ترجمہ اور تفسیر کی زبان اردو تھی۔

یہ اردو کیا ہے؟ اردو بابائے ملت حضرت قائد اعظم محمد علی جناحؒ کی زبان کا معاہدہ ہے کہ پاکستان کی زبان اردو اور صرف اردو ہو گی۔ اور یہ اردو حسینؓ کا سر ہے۔ تاریخ کے ہر کربلا میں اس کا سر قلم کیا جاتا ہے۔

عربی' فارسی' انگریزی' ہندی اور بنگالی زبانوں کو محبت سے اپنے دامن میں سمیٹنے والی کا نام اردو ہے۔ پھر بھی یہ دیش بدیش بھٹکتی ہے اور اس کے بولنے والے بھی جانے کب تک خانہ بدوش رہیں گے۔ کب تک اپنی جانیں اور اپنی عورتوں کی عصمتیں لٹاتے رہیں گے؟

امی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "یہ زبان ہم سب کو ایک ایک کر کے ختم کر دے گی۔ میں اسے مسجد میں چھوڑ آتی ہوں۔"

میں نے ان کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔ "نہیں امی! آپ ان کی زبان اچھی طرح نہیں بول سکتیں۔ میں جاؤں گا۔"

کلثوم نے میرا راستہ روک لیا۔ "ناتمی تھاکو آمی جابو (نہیں تم رہو۔ میں جاؤں گی)"

'ڈولی اپنی ماں کے پاؤں سے لپٹ کر رونے لگی۔ میں اپنی ماں کے سائے سے' کلثوم میرے سائے سے اور ڈولی کلثوم کے سائے سے محروم نہیں ہونا چاہتی تھی۔ ہم سب ایک دوسرے کے سائے سے بندھے ہوئے تھے۔ ایک ساتھ مر سکتے تھے مگر بچھڑ کر مرنا منظور نہ تھا۔

کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ سب تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ رات زیادہ ہونے لگی تو میں نے چٹائی پر لیٹتے ہوئے کہا۔ ہمیں یہ جگہ چھوڑ دینا چاہیے۔ یہاں کچھ لوگ مجھے پہچانتے ہیں۔"

کلثوم نے مشورہ دیا کہ ہم سب اس کے میکے چلے جائیں۔ وہاں کوئی ہمیں بہاری کی حیثیت سے نہیں پہچان نہیں سکے گا۔ یوں بھی میرا کوئی ذریعہ معاش نہیں تھا۔ بیوی کے

میکے میں کچھ عرصے تک مفت گزارا ہو سکتا تھا۔

امی ایک گوشے میں کلام پاک کو بدستور سینے سے لگائے بیٹھی تھیں اور ممتا بھری نظروں سے سہم سہم کر کبھی مجھے اور کبھی ڈولی کو دیکھ رہی تھیں۔ میں نے انہیں سو جانے کے لیے کہا اور خود سو گیا۔

رات کو کسی وقت کلثوم کی بھی آنکھ لگ گئی۔ ہم پچھلی کئی راتوں سے آدھی نیند سوتے تھے اور اس آدھی نیند میں بھی مارے دہشت کے جاگتے رہتے تھے۔ چونک چونک کر اٹھ بیٹھتے تھے۔ زندگی میں پہلی بار معلوم ہوا کہ نیند ہمیں ڈرانے کے لیے سلاتی ہے۔ یک بیک میری آنکھ کھل گئی۔ جیسے موت نے دھاوا بول دیا ہو۔ میرے ساتھ کلثوم بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

میں نے چاروں طرف دیکھا۔ امی نظر نہیں آئیں۔ شاید وہ قرآن شریف مسجد میں رکھنے نکل گئیں تھیں۔ ابھی کچھ اندھیرا تھا۔ میں کچھ دیر امی کا انتظار کرتا رہا پھر صبح ہوتے ہی میں ان کی تلاش میں نکل گیا۔

میں نے سب سے پہلے مسجد میں جا کر پیش امام سے پوچھا۔ "کیا یہاں میری امی کلام پاک لے کر آئی تھیں؟"

پیش امام نے مجھے ہمدردی سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا وہ تمہاری ماں تھی؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے میرے شانہ پر ہاتھ رکھ کر لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ اس کا نیک مقصد پورا ہو گیا۔ اس نے کلام پاک کو یہاں پہنچا دیا مگر وہ تمہارے پاس اب کبھی نہیں پہنچ سکے گی۔"

میرے دل اور دماغ کو شدید جھٹکا پہنچا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "شاید وہ گونگی تھی یا بولنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ لوگ پوچھتے رہے کہ وہ کہاں سے آئی ہے؟ اور یہ اردو ترجمہ پڑھنے والے کون لوگ ہیں؟ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔"

میں نے چشم تصور میں دیکھا کہ امی کی نگاہوں کے سامنے اپنے بیٹے اور پوتی کی صورتیں گھوم رہی تھیں اور میرے کانوں میں پیش امام کی آواز آ رہی تھی۔ "میں سمجھتا ہوں تمہاری ماں گونگی بن گئی تھی۔ جب بار بار پوچھنے کے باوجود وہ کچھ نہ بولی تو ایک مکتی باہنی کے جوان نے رائفل کے کندے سے اس کے منہ پر ضرب لگائی۔ وہ فرش پر گر کر

تڑپنے لگی۔ دو جوانوں نے رائفل کے کندے تان کر پھر سوال کیا مگر وہ ہمیشہ کے لیے شانت ہو گئی تھی۔"

میں روتے روتے مسجد کے زینے پر بیٹھ گیا۔ میری نگاہوں کے سامنے دین و دنیا مسجد و بت خانے سب ہی گڈمڈ ہونے لگے۔ وہ مسلمان ہیں جو قتل ہو رہے ہیں وہ بھی مسلمان ہیں، جو قتل کر رہے ہیں۔ میدان کربلا میں بھی قاتل اور مقتول مسلمان تھے۔ کیسے فیصلہ ہو کہ کون حق پر ہے؟ اگر کسی نے میری ماں کی زندگی اتاری تھی تو میں نے بھی کسی ماں کی ساری اتاری تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ میرا احساس جاگ گیا تھا۔ میں نے ساری واپس کردی تھی وہ زندگی واپس نہیں کر سکتے تھے۔

ہم دکھن منڈی کا مکان چھوڑ کر بنتال میں آ گئے۔ میرے ساس سسر ہمارا خرچ اٹھا رہے تھے۔ میں تو جیتے جی مر گیا تھا۔ امی کی ابدی جدائی نے مجھے نڈھال کر دیا تھا۔ پھر پتہ چلا کہ آسی گم ہو گئی ہے۔ میں ایک دم سے تلملا گیا۔ آدمی خواہ کتنا ہی بے حس ہو، جوان بہن کی گمشدگی سے اس کی غیرت ضرور جاگتی ہے۔ اگر وہ اپنی جان کی سلامتی کے باعث دشمنوں کو نہ للکارے تو اپنے آپ کو للکارتا ہے اور اپنے بچھڑے ہوئے رشتوں کو تلاش کرتا ہے۔

میں محمد پور پہنچا تو پتہ چلا کہ میرے بھائی جان کا گھر ایوب گیٹ کے قریب تھا اور فارم گیٹ کی طرف سے حملہ ہو سکتا تھا اس لیے وہ محفوظ نہ رہ سکتے تھے۔ وہ پناہ لینے کے لئے میرے پاس دکھن منڈی کی طرف چلے گئے تھے۔ دوپہر کو میرے بھائی جان کا بڑا لڑکا ہانپتا کانپتا آیا۔ اس نے بتایا کہ امی ابا اور چھوٹا بھائی سب ہی مارے گئے ہیں۔ آسی جوان تھی۔ حملہ آور اسے اٹھا کر کہیں لے گئے۔ میرا بھتیجا بڑی مشکلوں سے بھاگ کر چھپتا چھپاتا محمد پور تک واپس آیا تھا۔ وہاں کتنے ہی لوگ اسے اپنے ہاں پناہ دینا چاہتے تھے لیکن وہ میرپور کی طرف چلا گیا۔

میں اس کو تلاش کرنے کے لیے میرپور پہنچا۔ اس کے ذریعے آسی کا سراغ لگایا جا سکتا تھا۔ میں نے میرپور میں کتنے ہی لوگوں کو اپنے بھتیجے سلمان کا حلیہ بتایا کہ وہ دبلا پتلا سا اٹھارہ برس کی عمر کا لڑکا ہے۔ کئی لوگوں نے ایسے ایک لڑکے کو دیکھا تھا۔ ایک شخص نے کہا "جناب! وہ پاگل ہو چکا ہے۔ ادھر ادھر مارا مارا پھرتا ہے۔ کسی کے ہاں پناہ نہیں

لیتا۔ کوئی اسے کھانے کے لیے دیتا ہے تو وہ دودھ مانگتا ہے۔ کہتا ہے۔ امی کا دودھ پیوں گا۔ مگر کیسے پیوں گا۔ انھوں نے امی کی چھاتی کاٹ ڈالی۔ کہنے لگے۔ اب یہ بہاریوں کی نسل کو دودھ نہیں پلائے گی۔ میں پیوں گا۔ میں پیوں گا۔ امی دودھ......"

میں چکرا کر زمین پر گر پڑا۔ جنگل کے درندوں نے کبھی اپنی نسل کے خاتمے کے لیے کسی کی کوکھ نہیں جلائی۔ دودھ کے چشمے کاٹ کر کبھی لہو کی نہر کا افتتاح نہیں کیا۔ ایسے کارنامے صرف تہذیب کے جنگلوں میں ہوتے ہیں۔

مجھے چپ سی لگ گئی۔ اب کچھ بولنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ جب ہم مر نہیں سکتے تو اپنے اندر خاموشی اور سناٹا طاری کر کے عارضی مردے بن جاتے ہیں۔ مجھے اپنے اندر کی موت سے کچھ سکون حاصل ہو جاتا تھا۔ کلثوم شکایتیں کرتی تھی کہ پہلے میں کام چور تھا۔ ہاتھ پاؤں نہیں ہلاتا تھا۔ اب زبان بھی نہیں ہلاتا۔ کچھ پوچھو تو ہوں ہاں کہہ کر ٹال دیتا تھا۔

لیکن میرے پاؤں گردش میں تھے۔ میں آسی کو تلاش کرنے کے لئے محلے محلے گھومتا رہتا تھا۔ بائیس چوبیس برس کی کسی جوان لڑکی کو دور سے دیکھ کر بھاگتا ہوا جاتا پھر قریب پہنچ کر مایوس ہو جاتا تھا۔ کبھی کبھی شام کو بوڑھی گنگا کے کنارے جاتا تھا کیونکہ اکثر وہاں سے لاشیں بہتی ہوئی گزرتی تھیں۔ بہت سی لاشوں کو ساحل تک لایا جاتا تھا لیکن ان میں آسی نظر نہیں آئی۔

دن' مہینوں اور سالوں میں بدلتے جا رہے تھے۔ دن بہ دن مہنگائی ایسے بڑھتی جا رہی تھی کہ اناج اور کپڑا عام لوگوں کی قوت خرید سے باہر ہو چکا تھا۔ سیدھے سادے لوگ ایک وقت کسی طرح کھاتے تھے اور دوسرے وقت شرافت سے فاقے کرتے تھے۔ کچھ لوگ ہیرا پھیری سے پیٹ پال رہے تھے اور کچھ ایسے تھے جو جرائم میں اضافہ کر رہے تھے۔ ایسی خبریں بھی موصول ہوتی تھیں کہ کپڑا نہ ہونے کے باعث مرنے والوں کو کیلے کے پتوں میں لپیٹ کر دفن کیا جا رہا تھا۔

ان حالات میں میرے سسرال والے ہمارا بوجھ مزید نہیں اٹھا سکتے تھے۔ میں نے ملازمت کی کوشش کی تو ایک ماہ کی بھاگ دوڑ کے بعد ریڈ کراس کے ایک امدادی کیمپ میں وارڈ بوائے کا کام مل گیا۔ میں ایک بہاری نرس کا اسسٹنٹ تھا۔ اس کے علاوہ چار

نوجوان تھے جو دوسرے تمام شہروں کے امدادی کیمپوں سے رابطہ قائم کر کے ایسے لوگوں کی فہرستیں تیار کرتے تھے جو اپنے عزیزوں سے بچھڑ گئے تھے۔ اس طرح بہت سے لوگوں کا بھلا ہوتا تھا۔ ان فہرستوں کے ذریعے معلوم ہو جاتا تھا کہ ان کا کون سا عزیز کس شہر یا علاقے میں ہے۔

ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ تھی جو کھانا اور کپڑا حاصل کرنے کیمپ میں آتے تھے۔ ریڈ کراس سوسائٹی کروڑوں بھوکے اور ننگے لوگوں کو چاول اور کپڑا فراہم نہیں کر سکتی تھی۔ ہمارے کیمپ کے ایک انگریز نے کہا۔ "اس قدر بھوک اور افلاس کے باوجود آبادی بڑھ رہی ہے۔ لوگوں سے کہو کہ وہ خاندانی منصوبہ بندی پر عمل کریں۔ بچے کم ہوں گے تو اناج اور کپڑے کی قلت نہیں ہوگی۔"

ہم لوگوں کو سمجھانے لگے لیکن ہمارے سمجھانے سے کیا ہوتا ہے؟ ایک طویل مدت سے خاندانی منصوبہ بندی کی اہمیت اور افادیت سمجھائی جا رہی ہے اور جتنا زیادہ سمجھایا جا رہا ہے اتنے ہی زیادہ بچے ہوتے رہے ہیں۔ جب خاندانی منصوبہ بندی کے لیے ہمارے کیمپ میں کوئی نہ آیا تو انگریز صاحب نے کہا۔ "اپنے لوگوں کو کوئی لالچ دو۔ ان سے بولو کہ جو عورت آپریشن کرائے گی' اسے ایک ساری دی جائے گی اور نس بندی کرانے والے مرد کو ایک لنگی اور ایک بنیان ملے گی۔"

موجودہ حالات میں یہ بہت بڑا لالچ تھا۔ ہماری ایک ٹیم نے محلے محلے جا کر یہ اعلان کیا تو کچھ لوگ آنے لگے۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ وہ سب لنگی اور ساری کے لالچ میں آ رہے تھے۔ ہم رسمی طور پر ان سے سوالات کرتے تھے کہ کب شادی ہوئی اور ابھی ان کے کتنے بچے ہیں؟ وہ جو جواب دیتے تھے ہم یقین کر لیتے تھے۔ زیادہ تحقیقات کرنے کے لیے ہمارے ہاں کارکنوں کی کمی تھی۔

ایک بار ایک بوڑھی عورت میلی اور پھٹی ہوئی ساری پہن کر آئی۔ سسٹر نے اسے دیکھ کر کہا۔ "ماں جی! تم اس عمر میں یوں بھی بچے پیدا نہیں کر سکتیں۔ تم کس لیے آئی ہو؟"

وہ ہاتھ نچا کر بولی۔ "کیا پیدا کروں گی۔ تب ہی ساری دو گی؟ تم جوان چھوکری ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میرے بڑھاپے کا مذاق اڑاؤ۔"

سسٹر نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "مائی! معاف کرو۔ جھگڑا کرنے سے ساری نہیں ملے گی۔"

"تو پھر آپریشن کرو۔"

ہم سب اس بڑھیا کو حیرانی سے تکنے لگے۔ سسٹر اسے واپس جانے کے لیے کہہ رہی تھی۔ اس نے جھنجلا کر سسٹر کا گریبان پکڑ لیا۔ اور غصے سے لرزتے ہوئے بولی۔ "دیکھو میری ساری ایسی تار تار ہو رہی ہے کہ اب یہ مجھے چھپا نہیں سکتی۔ مجھے موت بھی نہیں آتی۔ بتاؤ کہ میں کس کے سامنے یہ دھجیاں اتاروں؟ کس حرامی بچے کی ماں بنوں کہ تمہیں یقین آجائے؟"

سسٹر کو پسینہ آنے لگا۔ ہم چار آدمی اس بڑھیا کو پکڑ کر ایک طرف لے گئے۔ اسے دیر تک سمجھاتے رہے۔ پھر اسے لالچ دیا کہ اگر وہ پانچ عورتوں کو آپریشن کے لئے لے آئے تو اسے ایک ساری دے دی جائے گی۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی۔

اکثر ایسی عورتیں اور مرد ہمارے لیے پریشانیوں کا باعث بن جاتے تھے۔ ایک دن ایک نوجوان لڑکا آیا۔ اس کی عمر بمشکل سولہ یا سترہ برس کی ہوگی لیکن وہ اپنی عمر پچیس برس بتا رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "تم کپڑے کے لالچ میں آئے ہو۔ تمہاری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی ہوگی۔"

اس نے کہا۔ "میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میری ایک بیوی ہے اور ایک بچہ ہے۔ ہم ایک بچے سے زیادہ بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔"

اس کی باتوں کا یقین کرنا پڑا کیونکہ ہنگاموں کے دوران بہت سے کم عمر لڑکوں اور لڑکیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ بہت سے گھرانوں میں جوان لڑکیوں کی عزت و آبرو قائم رکھنے کے لیے جو لڑکے بھی ملے' ان سے نکاح پڑھا دیا گیا۔ اس طرح یہ ہوا کہ ایک تو لڑکیاں عزت و آبرو سے رخصت ہو گئیں دوسرے یہ کہ جوانوں پر ان کی حفاظت کی ذمے داریاں عائد ہو گئیں۔

اس لڑکے نے کہا۔ "میرا نام ارشد ہے۔ میرے خاندان کے سب ہی لوگ مارے جا چکے ہیں۔ میں تنہا تھا۔ ایک شریف خاندان کے بزرگ نے اپنی صاحبزادی سے نکاح پڑھا دیا۔ اب میرا ایک بچہ ہے۔ میں اور بچے نہیں چاہتا۔ میں نس بندی کے لیے آیا

ہوں مگر میری ایک شرط ہے۔"

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا پھر ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "مجھے لنگی اور بنیان نہیں چاہیے۔ میں ساری لوں گا۔"

ہمیں اس پر بڑا پیار آیا۔ وہ بحیثیت مرد اپنے فرائض کو سمجھ رہا تھا کہ پہلے اپنی عورت کی عزت کو ڈھانپنا چاہیے۔ ہماری خاندانوں کے بزرگوں نے حالات کے پیش نظر دانش مندانہ فیصلے کیے تھے۔ اپنی لڑکیوں کو نوجوانوں کے نکاح میں دے کر انہیں معاشرے کا ذمے دار فرد بنا دیا تھا۔

ارشد شام تک ایک ساری لے کر چلا گیا۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ اب وہ کبھی باپ نہیں بن سکے گا۔ ایک بچے کا کیا بھروسہ جب کہ ہزاروں بچے بے موت مارے گئے تھے۔ اگر ارشد کے اکلوتے بچے کی زندگی نے دغا نہ کی تو کیا ہوگا؟

میں نے کہا۔ "اتنی کم عمری میں ایک بچے والے کی نس بندی نہیں کرنی چاہیے۔"

سب نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ شاید سب لوگ یہی سوچ رہے تھے۔ ایک نے کہا اگرچہ ہم دو یا تین بچوں کی شرط لگائیں گے تو کپڑے کے لالچ میں آنے والے تین بچوں کا حساب دیں گے۔ ہمارے پاس آدمی کہاں ہیں کہ ان کے گھروں میں جاکر صحیح معلومات حاصل کریں۔"

کبھی کبھار اتفاقاً معلومات حاصل ہو جاتی تھیں۔ ایک ہفتے بعد نرائن گنج سے ایک بیمار بوڑھے کو کیمپ میں پہنچایا گیا۔ اس نے اپنے بیٹے کا پتہ بتایا جو میرپور میں رہتا تھا۔ میں ایک ساتھی کے ساتھ اس کے بتائے ہوئے پتے پر میرپور پہنچا۔ وہاں پتہ چلا کہ وہ نیپال کے راستے پاکستان جانے کے لیے یہاں کی سرحد پار کر چکا ہے۔ ہم ناکام ہو کر لوٹنے لگے۔ گوردہاٹ کے قریب پہنچ کر یاد آیا کہ ارشد نے اسی جگہ کا پتہ لکھوایا تھا۔ جب وہاں تک پہنچ ہی گئے ہیں تو اس کی خیریت معلوم کر لینا چاہیے۔

ہم وہاں کے لوگوں سے پوچھتے ہوئے ایک جھونپڑی کے سامنے پہنچ گئے۔ تقدیر عجب تماشے دکھاتی ہے۔ وقت کو جیسے میرا انتظار تھا۔ اسی وقت جھونپڑی کا دروازہ کھلا تو میں ٹھٹک گیا۔ وہ بھی دروازے پر ٹھٹک گئی تھی۔ چند ساعت کے لیے ہم پر سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ پھر میں چیختا ہوا آسی کو پکارتا ہوا دروازے پر آیا اور اس سے لپٹ کر بے اختیار

رونے لگا۔ وہ بھی بلک بلک کر رو رہی تھی۔ میرا ساتھی باہر کھڑا رہا۔ میں نے دروازے کو بند کرتے ہوئے پوچھا۔ "تم کہاں گم ہو گئی تھیں؟"

اس نے جواباً دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو چھپا لیا۔ مجھے غلطی کا احساس ہوا کہ اب کسی بھائی یا باپ کو اپنی بہن یا بیٹی سے یہ سوال نہیں کرنا چاہیے۔ گم شدگی کے پیچھے چھپے ہوئے واقعات کا اندازہ کرتے ہوئے حیا آتی ہے۔

میں نے دوسرا سوال کیا۔ "تم یہاں کیسے پہنچ گئیں۔ یہ کس کا مکان ہے؟"

وہ دھیمی آواز میں بولی۔ "یہ میرے منے بھائی کا گھر ہے۔ میں غنڈوں سے پیچھا چھڑا کر بھاگتی ہوئی ادھر سے گزر رہی تھی۔ منے بھائی نے مجھے اس گھر میں چھپا لیا۔ میں چھ ماہ سے یہاں رہ رہی ہوں۔ وہ بہت اچھا لڑکا ہے۔ مجھے آپا جان کہتا ہے۔ تقدیر نے مجھ سے سارے رشتے چھین لیے مگر ایک چھوٹے بھائی کا پیار دے کر زندہ رہنے پر مجبور کر دیا۔"

میں آسی سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کلثوم کے میکے کیوں نہ آگئی لیکن شرم سے جھکی ہوئی گردن اور نگاہیں بتا رہی تھیں کہ ہم سے نگاہیں ملاتے ہوئے اب اسے حیا آتی تھی۔

اتنے میں ارشد دروازہ کھول کر اندر آیا پھر مجھے دیکھتے ہی گھبرا گیا۔ آسی نے میرا تعارف کرایا۔ وہ جلدی سے چٹائی بچھاتے ہوئے بولا۔ "آپ میرے بھائی جان ہیں۔ آیئے بیٹھیے۔"

میں نے پوچھا۔ "تمہاری بیوی اور بچہ کہاں ہیں؟"

"بیوی؟ بچہ؟" آسی نے حیرانی سے کہا۔ "ابھی تو منے بھائی کی شادی بھی نہیں ہوئی۔"

میرے دماغ کو بڑا سا جھٹکا پہنچا۔ تب میں نے دیکھا۔ آسی کی بدن پر وہی کیمپ سے لائی ہوئی ساری تھی اور میری بھیگی ہوئی آنکھوں کے سامنے منا بھائی سر جھکائے فرش پر اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔

○☆○